گذر زمانہ بدلی بہاری عمر بود

فرد:

آغاز:

ہست عاشق ال حیرانی
دمبدم تا قو را بگی رانی

رباعیات:

حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب ہیں ، آغاز ،

ای گشتہ عیان از رخت الوار ھدا
بگذار کہ بینم مہ رو یت بخدا

ترجیع بند :- آغاز ،

ما ناطق سر قل کفا یتم
تفسیر کلام کبریا ییم

قصیدہ (چھ قصیدے)

پہلے قصیدے کا آغاز اس طرح ہے۔

دوش این ندا بگوش من آمد دم سحر
کامی بی خبر قضای تو می گوید این قدر

مثنوی (دو مثنویاں):

پہلی دو مثنویوں میں شاعر کے متعلق ، خیمہ دوزی اور حلوا گری کے

اسلام کو بیان کیا ہے۔ ساتویں مثنوی عشق نامہ کے نام سے موسوم ہے۔ باقی چھ مثنویاں زیادہ تر شہنشاہ اکبر کی مدح میں ہیں۔

پہلی مثنوی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

کریما کارسازا کردگارا
رحیما مشفقا پروردگارا

حواشی

۱۔ ابوالفضل، آئین اکبری ص ۱۳۱ مطبوعہ مطبع نول کشور لکھنؤ [illegible]۔

۲۔ کیٹلاگ پرشین مینو سکرپٹس، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ جلد دوم ص ۱۶۳-۱۶۹ ۔ (ختم شد)

گلِ رعنا

(از برج لال رعنا جی)

اردو رباعیوں کا دل کش مجموعہ، جس کے متعلق حضرت جوش ملیح آبادی، حضرت جگر مرادآبادی، حضرت فراق گورکھپوری وغیرہ نے اچھے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

جگر مرادآبادی، رعنا صاحب کو ایک فطری شاعر کہہ کر خطاب کرتے تھے۔

صفحات: ۲۳۲   قیمت: ۱۲ روپے

قوموں کا عروج وزوال

اسباب وعلل کی روشنی میں

(جناب عبدالمبین صاحب دہلی)

آج کل جو تاریخی کتابیں ہمارے سامنے ہیں ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً پانچ ہزار سال سے انسانوں نے اپنی تاریخ لکھنی شروع کی اور اسی دو دنیا انسانی میں بہت سی قومیں بام عروج پر پہنچیں ۔ اور بہت بڑے علاقے کو تا کرکے عظیم الشان حکومتیں اور سلطنتیں قائم کیں ۔ لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ ہی قو زوال پذیر ہو کر نیست ونابود ہو گئیں ۔

ان حقائق نے سائنسدانوں اور اہل فکر حضرات کو مجبور کیا ہے ۔ کہ وہ اسباب وعلل کا جائزہ لیں، جنکی وجہ سے یہ تبدیلیاں رونما ہوئیں ۔ چنانچہ بہت سے مفکرین اور فلسفیوں نے ان اسباب سے بحث کی ہے ۔ اور اپنی معلومات روشنی میں حقیقت حال سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے ۔ ان میں سے چار مفکر آج کی علمی دنیا میں بہت اہمیت رکھتے ہیں ۔ اور واقعی ان کے تجزیے بہت ہی بصیرت افروز ہیں ۔

اس مضمون میں انہیں مفکرین کی تحریروں کی روشنی میں قوموں کے عر وزوال کے اسباب کا جائزہ پیش کیا جائے گا ۔

پورے یورپ میں صدی کا مشہور ترین فلسفی مورخ ابن خلدون[1] کا کہنا ہے۔ کہ قوموں کا زوال و ترقی محض اختیار پر منحصر نہیں ہے بلکہ وہ اپنے وجود و ترقی کے ہر مرحلے پر معنوی رشتوں سے منسلک اور وابستہ رہتے ہیں[2] اور یہ معنوی رشتے ایک ایسے جذبے سے پیدا ہوتے ہیں جسے ابن خلدون عصبیت کا نام دیتا ہے[3] جس سے مراد وہ قوت ہے جو کسی گروہ یا قوم میں محبت، اخوت اور یکجہتی کے شدید احساس پیدا کرتی ہے۔

جب تک جذبۂ عصبیت کسی قوم میں توانا رہتا ہے اس وقت تک قوم ترقی و عروج کی منزلیں طے کرتی ہے۔ لیکن مختلف عوامل کی بنیاد پر جب یہ جذبہ کمزور ہو جاتا ہے تو قوم روبزوال ہو جاتی ہے۔ اور جوں جوں یہ اتحادی جذبہ انتشاری قوت میں بدلتا جاتا ہے قوم فرقہ بندیوں کا افسانہ بن کر تباہ ہو جاتی ہے۔

سلہ:- ابن خلدون (پ ۱۳۳۲ء م ۱۴۰۶ء) شمالی افریقہ کے ملک تیونس میں ایک عرب خاندان میں پیدا ہوا یہ ایسا جامع الکمالات انسان تھا کہ مختصر عرصے میں بحیثیت وزیر، جج اور ماہر اسلامیات کے آفاقی شہرت حاصل کرلی اور آخر عمر میں اس نے اپنی معلومات و تجربات کی روشنی میں ایک نہایت ہی بصیرت افروز کتاب لکھی جس کا پہلا حصہ مقدمہ ابن خلدون، کے نام سے بہت مشہور رہا اور یورپ نے اس سے فائدہ اٹھا کر مختلف علوم کی بنیاد رکھی ہے کہ علم الاجتماع یا علم فلسفہ تاریخ وغیرہ
یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ابن خلدون نے بلاواسطہ صرف مغربی مسلم قوموں اور سلطنتوں کا مطالعہ کیا تھا اسی لئے اس کے تجزیئے میں ان قوموں کی فکری اور عملی مظاہر کی جھلک ہے اور یہ بھی چیز سامنے رہنی چاہیے کہ اس دور کا سماج جاگیردارانہ تھا جس میں آمدنی کا اصل ذریعہ زمین اور زراعت ہوتی ہے۔

سلہ:- ڈاکٹر بشارت علی ۔ مقدمہ ابن خلدون (اردو ترجمہ) کا پیش لفظ ۔ ص ۸۹

سلہ:- ابن خلدون ۔ مقدمہ ابن خلدون (اردو ترجمہ) ص ۳۶۵ ۔

اشتراکی جبلت سے مراد انسان کا مشہور ترین ... فلسفی ایڈورڈ ... ... یا ... انسانوں میں یہ خواہش موجود ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہیں۔ ایک دوسرے کی مدد کریں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوں۔ ایک دوسرے کی خواہشات کا احترام کریں اور ایک دوسرے کی مدد کریں وغیرہ اسی خواہش کو انسان کا ... معاشرتی رجحان کہا جاتا ہے۔

لیکن حضرت انسان کی تضاد پرست طبیعت میں ایک ایسا رجحان بھی ہے جو معاشرتی رجحان کی نفی کرتا ہے کیونکہ انسان علیحدہ بھی رہنا چاہتا ہے اور اس میں انفرادیت کا بھی جذبہ ہے اور بعض حساس اہل فکر ایسے بھی ہوتے ہیں جو معاشرے کے اقدار سے مطمئن نہیں ہوتے اور معاشرے کی بے انصافیوں اور ناہمواریوں سے مفاہمت نہیں کرتے اور بعض افراد جو اپنی فکری صلاحیتوں اور پیہم کاوشوں کی وجہ سے علم و فن

کانٹ (پ ۱۷۲۴ء م ۱۸۰۴ء) مشہور جرمن فلسفی، ریاضی دان اور ماہر فلکیات تھا اس کی زندگی اتنی با اصول تھی کہ اسے لوگ "مشین" کہا کرتے تھے عورت اور موسیقی سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کونگس برگ یونیورسٹی میں منطق اور مابعد الطبیعات کا پروفیسر مقرر ہوا (اردو دائرہ انسائیکلوپیڈیا لاہور ۱۹۶۸ء ص ۱۱۴۲) مجموعی طور پر کانٹ فلسفی زیادہ اور مورخ کم ہے۔ لیکن چونکہ اس کا تعلق جرمنی سے تھا جو یورپ کے جدید فلسفیانہ اور سائنٹفک نظریات کا تصورات کا منبع ہے اور صنعتی دور کا ایسا علاقہ ہے جس نے دور جدید کے نشیب و فراز کا سب سے زیادہ مقابلہ کیا ہے۔ صنعتی دور کی خصوصیت یہ ہے کہ ایسی آمدنی کا اصل ذریعہ مصنوعات اور تجارت ہوتی ہے کانٹ نے صنعتی دور کا یورپ میں سب سے بڑا فلسفیانہ مطالعہ کیا ہے اور اس موضوع پر اس کے دو مقالات، عالمی تاریخ کا تصور آفاقی نقطہ نظر سے اور "دائمی امن" بہت ہی فکر انگیز ہیں۔

کے اعلیٰ عہدوں پر پہنچ جاتے ہیں جبکہ معاشرے کی غالب اکثریت کم تعلیم یافتہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ افراد کی معاشرے کی اکثریت سے کٹ جاتی ہے اور یہ افراد اپنے آپ کو معاشرے میں کسی حد تک اجنبی سمجھنے لگتے ہیں اور معاشرہ بھی درحقیقت میں ان کو اہمیت نہیں دیتا جس کی وجہ سے ان افراد میں معاشرے کے خلاف ایک قسم کی بغاوت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جو کہ زیادہ تر فکری نوعیت کا ہوتا ہے۔ اسی قسم کی بغاوت یا معاشرے کی مخالفت کا رجحان یوں تو ہر انسان میں موجود ہوتا ہے، لیکن بعض انسان میں مخالفت کا یہ جذبہ زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ انسان کی ذہنی تعمیر میں معاشرتی رجحان بھی اور غیر معاشرتی رجحان بھی۔ [۱]

کانٹ کہتا ہے کہ ان دو متضاد رجحانات کی کشمکش کی وجہ سے انسان ترقی کرتا ہے اور اگر انسان محض معاشرتی رجحان کے زیر اثر رہتا تو ہمیشہ لکیر کا فقیر رہتا، کوئی نئی بات کبھی پیدا نہ ہوتی (کیونکہ ہر نئی بات عام باتوں سے علیحدہ ہوتی ہے ورنہ وہ "نئی" نہ ہوگی) افکار تازہ پیدا نہ ہوتے، سائنسی ایجادات نہ ہوتیں، انسان کاہل کر مست رہتا اور سست ہو جاتا۔ انسان کے غیر معاشرتی رجحانات، اسے خواب سے بیدار کرتے ہیں اور اس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ اس میں ایک دوسرے کے ساتھ صحت مند مقابلے کا رجحان پیدا کرتے ہیں اور نوع انسانی کی تاریخ ترقی کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اور اس طرح اخلاقی قانون کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔ جو کانٹ کے خیال میں انسان کی تعمیر کی بنیاد ہے۔ [۲]

---

[۱] ڈاکٹر مرزا افتخار حسین، قوموں کی شکست و زوال کے اسباب کا مطالعہ، لاہور ۱۹۷۶ء صفحات ۱۸۳ – ۱۸۲ –

[۲] حوالہ بالا " " صفحہ ۱۸۳

انیسویں صدی کے مشہور ترین فلسفی ہیگل شوؔ نے فلسفے میں جدلیات کا ایک بہت مشہور نظریہ "نظریہ جدلیت" پیش کیا جس کی رو سے ہر تصور اپنی ضد پیدا کرتا ہے کیونکہ کسی تصور کو مکمل تصور نہیں کیا جا سکتا، جیسے روشنی کا تصور پیدا ہوا۔ اس کا کوئی تصور اسی وقت مکمل ہو سکتا ہے جبکہ اس کی ضد بھی موجود ہو۔ اور ہر تصور بڑھتے بڑھتے بڑھ کر اپنی نفی کر لیتا ہے۔ جیسے کہ روشنی ایک حد سے بڑھ کر ظلمت کے مترادف ہو جاتی ہے۔ کیونکہ حد سے بڑھ کر روشنی نظارہ سوز ہوتی ہے۔ اور جب ایک تصور حد سے بڑھ کر اپنی نفی کر لیتا ہے تو ایک نئے تصور کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جسے منفی تصور کہہ سکتے ہیں۔ اسی منفی تصور میں پہلے تصور کی صرف ناقص پہلو کی نفی ہوتی ہے : جیسے ماں اور بچے کی محبت فطری ہوتی ہے لیکن بچے کی تربیت کے لئے ماں بچے کے ذہن میں خوف کا تصور بھی پیدا کرتی ہے (جو محبت کی ضد ہے) اسی طرح محبت کے تصور نے بڑھ کر اپنی نفی کر لی اور اپنی ضد پیدا کر لی، یعنی مثبت تصور بڑھ کر منفی تصور میں بدل گیا۔ لیکن مثبت تصور یعنی محبت کے تصور کی بالکل نفی نہیں ہوتی بلکہ محبت کے اسی پہلو کی نفی ہوتی جو بچے کے لئے مضر تھا۔ اسطرح مثبت تصور یعنی عمل THESIS اور منفی تصور یعنی ردعمل (ANTI THESIS) مل کر ایک نیا تصور پیدا کر لیتے ہیں جسے اتحاد SYNTHESIS کہا جا سکتا ہے۔ جس میں مثبت تصور اور منفی تصور دونوں کی "یاد" باقی رہتی ہے۔ شوؔ

شوؔ۔ ہیگل (پ ۱۷۷۰ م ۱۸۳۱ء) مشہور جرمن عالم اور فلسفی تھا۔ ہیڈل برگ اور برلن یونیورسٹی میں فلسفے کا پروفیسر رہا۔ اس کا مطالعہ دینیات، تاریخ، فلسفہ، ادب، مابعد الطبیعات اور منطق پر بڑا گہرا تھا۔ (اردو انسائیکلو پیڈیا، لاہور، ۱۹۶۸ء۔ صفحہ ۱۵۲۴)

شوؔ۔ ڈاکٹر آغا افتخار حسین، قوموں کی شکست و زوال کے اسباب کا مطالعہ، لاہور ۱۹۷۵ء صفحہ ۱۴۴)

ہیگل نے اپنے اسی نظریے کی مدد سے تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کی اور کہا کہ "تاریخ انقلابات کے سلسلے کا نام ہے" تاریخ میں ایک واقعہ پیش آیا۔ اسے مثبت کہا جا سکتا ہے۔ اس واقعے کے اثرات کے مدت گزر جانے سے اس کے خلاف ردعمل ہوا اور اس کی نفی ہو گئی اور ایک دوسرا واقعہ پیش آیا جسے منفی کہا جا سکتا ہے پھر ان دونوں واقعات مثبت اور منفی سے ایک تیسرا واقعہ پیش آیا۔ اسی طرح تاریخ کا جدلیاتی عمل جاری ہے۔ اسی سے ظاہر ہوا کہ ترقی اسی صورت میں ممکن ہے جب عمل اور ردعمل (مثبت و منفی) جاری رہیں۔ اہم واقعات اسی دور میں ظہور پذیر ہوتے ہیں جب واقعات کا عمل اور ردعمل شدت اختیار کر لیتا ہے۔ اور ایک تیسرا اہم واقعہ وجود میں آتا ہے۔

تاریخ کی حرکت ہیگل کی نظر میں کچھ اس طرح ظہور پذیر ہوتی ہے کہ جب کوئی قوم ترقی کرتے کرتے ایک منزل پر پہنچ جاتی ہے، جہاں اس کی تمام صلاحیتیں بروئے کار آ جاتی ہیں تو یہ ایک اہم منزل ہوتی ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر قانون جدلیت کے تحت نفی کا عمل شروع ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ قوم یہ محسوس کرتی ہے کہ اس کی تمام صلاحیتیں ابھر کر سامنے آ گئیں۔ اور اس نے ایک خاص قسم کا طرز زندگی حاصل کر لیا۔ اب باقی کیا رہا؟ اسی تصور کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم آہستہ آہستہ اپنے طرز زندگی سے اکتا جاتی ہے اور جن قوانین اور اصولوں کے ذریعے اس نے عروج حاصل کیا تھا، وہ اسے فرسودہ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اسی طرح ایک تاریخی تصور کی نفی ہو جاتی ہے۔[9]

اب دو صورتیں پیش آتی ہیں۔ یا تو قوم اسی نظام زندگی کو فرسودہ قرار دینے کے بعد اس کے خلاف ردعمل کا مظاہرہ کرتی ہے اس کی خامیاں معلوم کر کے انہیں دور کرتی ہے۔ اس طرح منفی کیے ہوئے تصور کے ردعمل سے ایک نیا تصور یعنی مثبت تصور یا طرز

۹؎ حوالہ مذکورہ بالا صفحات ۱۹۶ - ۱۹۷

زندگی پیدا کرتی ہے ... تبدیلی کی طرف ... ہوتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ پرانے نظام کو ہی بہتر قرار دینے کے باوجود اس کے خلاف رد عمل پیش کرتی اور مسائل پر تنازعت کرتی ہے۔ جس سے پرانے نظام کے تناقص باقی رہتے ہیں۔ اس طرح ملک قصور منفی ہی رہتا ہے اور ایک لحاظ سے تہذیب کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اور ساتھ قوم کی بھی۔ [10]

بیسویں صدی کا سب سے مشہور برطانوی مورخ آرنلڈ ٹوائن بی [11] نے قوموں کے عروج سے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے، اسے "چیلنج اور اس کا جواب" کا نظریہ کہا جاتا ہے، جس کا مطلب ٹوائن بی کے نزدیک یہ ہے کہ انسان تہذیبی منازل اسی وقت طے کرتا ہے، جب اسے کسی چیلنج کا مقابلہ کرنا پڑے۔ انسان یا قوم اپنے حال میں مگن رہتی ہے۔ لیکن جب کسی شدید مشکلات سے دوچار ہوتی ہے تو اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ذہنی و مادی ساز و سامان اکٹھا کر کے چیلنج کا مقابلہ کرتی ہے۔ اس طرح چیلنج اور اس کا مقابلہ قوم کو سخت جان اور طاقتور بنا دیتے ہیں

۱۰۔ حوالہ مذکورہ بالا صفحات ۱۹۷

۱۱۔ آرنلڈ ٹوائن بی (پ ۱۸۸۹ء) برطانیہ میں پیدا ہوئے۔ لندن یونیورسٹی میں ادبیات اور تاریخ کے پروفیسر رہے۔ بیسویں صدی کے سب سے مشہور اور مستند مورخ مانے جاتے ہیں ان کی شہرہ آفاق کتاب A STUDY OF HISTORY ہے۔ اس کی بارہ جلدیں ہیں جو دنیا میں پائی جانے والی تمام تہذیبوں پر نہایت عالمانہ تجزیہ و تحلیل پیش کرتی ہیں۔

اور حقیقت یہ ہے کہ دور جدید نے مطالعہ تاریخ کے نئے جو نئے تصورات اور طریقے ایجاد کئے ہیں اور چھاپہ خانے وغیرہ کی ایجاد سے مستند اور نادر کتابوں کی فراہمی آسان کر دی ہے۔ ان تمام سہولیات سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے ٹوائن بی نے تاریخ کا ایسا وسیع، محققانہ اور مبصرانہ جائزہ لیا ہے کہ اس کی کوئی مثال نہیں پیش کی جا سکتی۔

اور بعض اوقات تہذیب کی ترقی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور تو اور کئی سے مختلف تہذیبوں کا وجود ۔ کر کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ جب قوم کو چیلنج کا سامنا نہ رہا۔ تو قوم میں تعطل سے پہلے ترقی کی رفتار کم ہوئی پھر ترقی رک گئی اور پھر قوم رجعت قہقری کی طرف گامزن ہو گئی۔ جہاں وہ چیلنج سے پہلے تھی۔[۱۲]

لیکن بعض اوقات چیلنج اسی قدر زبردست ہوتا ہے کہ قوم اس کا مقابلہ کرنے سے ناکام ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بعض اوقات چیلنج اسقدر کمزور ہوتا ہے کہ قوم اس سے زیادہ متاثر نہیں ہوتی۔ اور مقابلہ نہیں کرتی۔ چنانچہ چیلنج اگر بہت سخت ہو یا بہت کمزور تو دونوں صورتوں میں قوم یا تہذیب ترقی نہیں کرتی۔ تہذیب اسی وقت ترقی کر سکتی ہے۔ جب نہ صرف چیلنج کا مقابلہ کامیاب ہو۔ بلکہ یہ کامیابی ایک مزید چیلنج کا پیش خیمہ ثابت ہو اور پھر اس کا مقابلہ کیا جائے اور وہ مقابلہ کامیاب ہو۔ یہ سلسلہ جب تک جاری رہے گا۔ ترقی ہوتی رہے گی۔ جہاں یہ سلسلہ ٹوٹ جائے گا، ترقی رک جائے گی۔

اور اصل ترقی اس وقت ہوتی ہے۔ جب انسان کی قوتیں مادی اور بیرونی مشکلات پر قابو پانے کے بعد روحانی اور داخلی چیلنج کا مقابلہ کرتی ہیں۔ اور کامیاب ہوتی ہیں۔

اور ہر قوم و معاشرے کی اصل طاقت و حرکت کا سرچشمہ اس کی تخلیقی اقلیت، ہوتی ہے۔ یہ معاشرے کے زیادہ ذہین اور طباع افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور معاشرے و قوم پر دو طرح سے اثر انداز ہوتی ہے۔ اوّل یہ کہ یہ نئے افکار تخلیق کرتی ہے۔ اور حسب توفیق اختراعات و ایجادات پیش کرتی ہے۔ دوم پھر یہ کوشش کرکے معاشرے

۱۲۔ ڈاکٹر آغا افتخار حسین، قوموں کی شکست و زوال کے اسباب کا مطالعہ، لاہور، ۱۹۷۹ء، صفحہ ۲۰۸

یا قوم کو اپنا ہم خیال بنا لیتی ہے۔ اس کے بعد عوام بھی ویسے ہی ان کی طرح سوچنا شروع کر دیتے ہیں یا کم از کم ان کی ظاہری عادات و اطوار سے متاثر ہو کر انہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اس طرح یہ تخلیقی اقلیت معاشرے کی اصل طاقت ہوتی ہے جو اکثریت کی رہنمائی کا فرض انجام دیتی ہے اور معاشرہ ترقی کے منازل طے کرتا ہے لیکن جب یہ تخلیقی اقلیت، مسخ ہو جاتی ہے۔ تو معاشرہ اور قوم زوال پذیر ہو کر برباد ہو جاتی ہے۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ تخلیقی اقلیت مسخ کیوں ہو جاتی ہے۔ ٹوائن بی کی رائے میں ہوتا یہ ہے کہ جب تک اقلیت واقعی نئے افکار اور اس کے نتیجے میں نئے ادارے تخلیق کرتی رہتی ہے۔ تو اس کی صلاحیت باقی رہتی ہے۔ لیکن جب یہ اقلیت نئے افکار اور نئے ادارے تخلیق کرنا چھوڑ دیتی ہے اور پرانے افکار اور فرسودہ اداروں سے لوگ بغاوت کر دیتے ہیں اور یہ ادارے تباہ ہو جاتے ہیں یا یہ فرسودہ ادارے کچھ عرصہ تو قائم رہتے ہیں۔ لیکن ان کو قائم رکھنے والی طاقتیں اور جماعتیں مسخ ہو جاتی ہیں۔ اور اپنی موت آپ مر جاتی ہیں اور ان دونوں صورتوں میں زوال یقینی ہے۔

تیسری صورت میں قوم کی تخلیقی صلاحیتیں جب مسخ ہو جاتی ہیں۔ تو وہ مختلف قسم کے بُت تراش لیتی ہے۔ اور ان کی پرستش کرنے لگتی ہے۔ جس کا نتیجہ بھی محکومی اور غلامی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔

ایک بُت فتح یا کامیابی کا ہوتا ہے، یعنی جب قوم ایک چیلنج کا مقابلہ کر لیتی ہے۔ تو اس کی خوشی میں اس طرح سرشار ہو جاتی ہے کہ اس کامیابی کا بُت تراش کر کے اس کی پوجا شروع کر دیتی ہے اور یہ یقین کر لیتی ہے کہ ہر بار اسے کامیابی ملے گی۔ جس کی وجہ

سلہ ۔ ڈاکٹر آغا افتخار حسین، قوموں کی شکست و زوال کے اسباب کا مطالعہ، لاہور، ۱۹۷۹، صفحہ ۲۲

ہے جس میں عہد اور معتقد کا حوصلہ کمزور ہو جاتا ہے۔ اور دوسرا [illegible] اس کو شکست سے [illegible] کر دیتا ہے۔

دوسرا بت قدیم اور روایتی اداروں کا ہوتا ہے۔ مثلاً ادارہ بادشاہت یا دیگر ... بھی ان کی افادیت ایک زمانے میں مسلم تھی، لیکن جب انہوں نے بتوں کی صورت اختیار کر لی۔ اور لوگ ان کا احترام کر کے ان کو پوجنے لگے۔ تو ان اداروں کی شکست میں عقلیں اور مکروہی آ گئی۔

تیسرا بت قدیم فنون کا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ علوم جو صدیوں قبل ایجاد ہوئے تھے، ان میں اسی طرح جکڑے رہا جائے۔ گویا کہ وہ مقدس ہیں، ان کی پوجا کا مطلب سعادت ہے۔ اور وہ دوسرے علوم، جن کے باعث آج دنیا کی باگ ڈور سنبھالی جاتی ہے ان سے بے اعتنائی برتی جائے۔

ٹائن بی کے نزدیک تہذیب کی شکست و انتشار کی علامتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول تہذیب کے جسم یا معاشرے کی شکست۔ دوم۔ تہذیب کی روح کی شکست۔

کسی تہذیب کا جسم شکستہ ہو کر تین ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ جس کی نوبت یہ ہوتی ہے کہ غالب اقلیت خود کو منظم کر کے مختلف طبقوں جیسے کہ قانون داں، سرکار کا فرمان اور کچھ مفکروں کو ملا کر حکومت کرنے کا پروگرام بناتی ہے۔ اور اس کے روح رواں وہ افراد ہوتے ہیں۔ جو عوام کا استحصال کرتے رہتے ہیں۔ اور جب عوام یہ دیکھتے ہیں کہ ان کا مستقل استحصال کیا جاتا ہے۔ تو وہ غالب اقلیت سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ اور ہمسایہ تہذیبیں اس کی دشمن ہو جاتی ہیں۔ اور اکثر اوقات حملہ آور ہو کر نقصان پہنچاتی ہیں۔

روح کی شکست سے مراد وہ انتشار و بدنظمی ہے۔ جو تہذیب کے ٹوٹتے وقت

اور دنیا [illegible] ہے [illegible]

ختم ہونے کے بعد عام افراد کے تخلیقی توازن برقرار نہیں رہ سکتا [illegible]

[illegible] ثبت ہو جاتا ہے۔

زندگی کے [illegible] یہ ہے کہ [illegible] یا کسی [illegible]

[illegible] سے دوچار ہوا۔

تخلیقی اقلیت کا ذوق پست ہو کر عامیانہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ ذوق ہی پھر انسانی زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔ خواہ مذہب ہو اخلاق ہو خواہ تعلیم و تربیت۔

[illegible] جنہیں آج کی علمی دنیا قوموں کے عروج و زوال کے سلسلے میں تسلیم کرتی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی تمام قوموں نے چاہے ان کی قومیت علاقے کی بنیاد پر ہو۔ چاہے نسل و ذات کی بنیاد پر ہو یا مذہب و عقیدے کی بنیاد پر، انہوں نے اس وقت ترقی کی ہے۔ اور عالم انسانی پر اپنی سرحد کا جہانگیری کا علم نصب کیا ہے۔ جب ان کی تخلیقی اقلیتوں نے ایسے اصول وضع کئے، جنہوں نے پوری قوم کے خیالات احساسات اور ارادوں میں یکسانیت پیدا کر کے انہیں متحد کیا اور لوگوں کے معاشرتی وغیرہ معاشرتی مثبت و منفی، رجحانات میں تصادم کو تیز تر کر کے انہیں اندھی تقلید و رسوم و ابتداء کے غاروں سے نکال کر عقلیت و حقیقت شناسی کی ان وادیوں میں کھڑا کیا جہاں سے خاک نشینوں نے بڑھ کر ستاروں پر کمندیں ڈال دیں۔ صحراؤں و بیابانوں کو روند کر وہاں اپنی مہذب بہ ہر دم [illegible] پر وقار بستیاں آباد کیں۔ سمندروں کی گہرائیوں میں اتر کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ کر اور زمین کی تہوں کو کھود کر معاشرے کے استحکام کے ذرائع فراہم کئے اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کی سب سے ترقی یافتہ طاقتور اور پرشکوہ قومیں بن گئیں۔

لیکن تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ اکثر یا تمام عروج پر پہنچنے والی قوتیں انسانیت

کر سکا جس طرح ہمیشہ سے رہی ہے ۔ سماج کی ترقی یا تنزلی میں مجموعی طور پر انسانیت کو امن و امان اور عدل و انصاف سے محروم رکھا ہے ۔ یہ دن دونی رات چوگنی مادی ترقیاں تو کر رہی ہیں ۔ لیکن وہ ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاقی اصول پیدا نہ کر سکے ہیں ۔ جو انسانیت کے لئے بہت خطرناک ہو گئے ہیں ۔ اور انسانی سماج کے لئے ناسور بن کر اس کو کئی دکھوں اور بے چینیوں سے تڑپا رہے ہیں ۔

جس کی وجہ یہ ہے کہ جو قومیں وحی الٰہی کی رہنمائی کے بغیر ترقی کرتی ہیں ان کی سرفرازیوں کا انحصار استحصالی قوتوں اور حیوانی خواہشات پر ہوتا ہے جس کے نتیجے میں سماج کی اکثریت کے حصے میں صرف الجھنیں ، مصیبتیں ، دور پریشانیاں اور سرگرانیاں ہی آتی ہیں ۔

یہ سب تاریخ کے حقائق ہیں ۔ لیکن تاریخ انسانی کی یادداشت ایک ایسے دور کو بھی محفوظ کئے ہوئے ہے ۔ جہاں قوم کی اکثریت کو عدل و انصاف اور اخوت و مساوات ملا تھا ۔ یہ دور ساتویں صدی میں اس وقت شروع ہوا جب عرب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی کی روشنی میں لوگوں کو ایسے اصول و اقدار سے روشناس کرایا جسے "اسلام" کے نام سے جانا جاتا ہے ۔

جب ایک ذلیل پسماندہ اور شکست خوردہ قوم نے اسلام کی روشنی میں اپنے وقت کی للکار کو سمجھا اور اس کا جواب دینے کے لئے مادی اور ذہنی طور پر تیار ہوئی تو دنیا نے ایک ایسی طاقت اور قوم کے استادوں کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھا جس نے عرب سماج کو بلند کر دیا ۔ جس کی وجہ سے عربوں کے فکر و عمل میں وہ توانائی پیدا ہوئی کہ وہ دنیا کی سب سے طاقتور اور انصاف پسند قوم کہلائی ۔ اور ان کا چرچا ساری دنیا میں ہونے لگا ۔ جس کی وجہ سے "اسلام" کے ماننے والوں کی تعداد آج کی دنیا میں کروڑوں تک پہنچ گئی ہے ۔ جنہیں آج کل "مسلمان" کے نام سے جانا جاتا ہے ۔